اسلام
باب اوّل

محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم

از ڈاکٹر فضل الرّحمٰن ☆ ترجمہ: مظہر الدّین صدّیقی

(۲)

مکّی زندگی کے ابتدائی دَور ہی میں قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ آپؐ پہلے اپنے اقربا اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیجئے ۔ وانذر عشیرتک الاقربین ۔ اس طریقِ عمل میں کوئی قومی جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ اس دور کی تاریخ میں جو قوتیں سرگرمِ کار تھیں انہیں اسلام کے اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی یہ ایک مخلصانہ کوشش تھی ۔ مورّخ ابن خلدون کو اس حقیقت کا واضح شعور تھا ۔ چنانچہ اس نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ اسلامی تحریک کی ابتدا کرنے کے لئے عربوں کی قومی عصبیت سے کام لینا ضروری تھا ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں دہلی کے عظیم مفکّر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اسی اصول کے پیشِ نظر اس امر کی وضاحت کرنی ضروری سمجھی کہ اسلام کو ایک عالم گیر دین کی حیثیت سے ترقی دینے کے لئے یہ بے حد ضروری تھا کہ اس کے احکام و اوامر میں عربوں کے قومی مزاج کی خصوصیات کو مرعی رکھا جائے ۔ لیکن سب سے زیادہ بنیادی حقیقت وہی ہے جس کا اظہار ہم مختلف طریقوں سے پہلے ہی کر چکے ہیں یعنی یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا خدا ایسا خدا نہ تھا جو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو کہ آیا وہ تاریخ پر اثر انداز ہوگا یا نہ ہوگا ، بلکہ قرآن نے خدا کا جو تصور پیش کیا ، اس کے لحاظ سے خدا خود تاریخ کی تشکیل میں موثر ہونا چاہتا ہے ۔ اگر تاریخ اللہ تعالیٰ کا میدانِ عمل ہے تو اس تعریف کی رو سے تاریخ کے تمام عوامل اور قوتوں کو جتنی بصیرت کے ساتھ ممکن ہو ، اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنا ضروری ہے ۔

لیکن ان تمام باتوں کے ماسوا رسول اللہؐ نے اہلِ مکّہ کے مقابلہ میں جو اقدامات فرمائے ان کا فوری سبب یہ تھا کہ خود اہلِ مکّہ آمادۂ فساد تھے ۔ حالاں کہ مسلمان اب ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے ۔ اہلِ مکّہ نے نہ صرف ان مہاجرین کی زمینوں اور جائدادوں پر قبضہ کر رکھا تھا جنہیں انھوں نے عملاً اُن کے گھروں سے نکالا تھا ،

بلکہ رسول اللہؐ اور آپؐ کے مکی پیروؤں نے مدینہ کے قبائل کے ساتھ جو معاہدہ کیا وہ بھی اہل مکہ کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ اس لئے یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اہل مکہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کریں اور وہ واقعتاً مدینہ پر قبضہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل قدرتی امر تھا کہ مدینہ کے مسلمان اس خطرہ کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوں اور قریش مکہ کے منصوبہ کو ناکام بنانے کی کوشش کریں، دوسرے الفاظ میں اس وقت دونوں فریقوں کے مابین حالتِ جنگ قائم تھی۔ قرآن خود اس واقعہ کی تاریخی شہادت دیتا ہے جب وہ ایک جھڑپ کے بارے میں کہتا ہے جو رسول اللہؐ کی صریح اجازت کے بغیر مسلمانوں کے ایک گروہ اور قریش کے ایک قافلہ کے درمیان شہر حرام میں واقع ہوئی۔ حالاں کہ ان مہینوں میں عرب کے بین القبائلی قانون کی رو سے جنگ وجدال کی اجازت نہ تھی۔

یسئلونک عن الشھر الحرام قتالٍ فیہ۔ قل قتالٌ فیہ کبیر۔ و صد عن سبیل اللہِ وکفر بہ و المسجد الحرام و اخراج اھلھا منہ اکبر عند اللہ۔ والفتنۃ اکبر من القتل۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ (سورہ البقرہ۔ آیت ۲۱۷)

(لوگ آپؐ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس میں قتال کرنا جرم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے ان کو اس سے خارج کر دینا جرم عظیم ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پردازی کرنا قتل سے بدرجہا بڑھ کر ہے اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ جاری رکھیں گے اس غرض سے کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔)

عام طور پر مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فوجی اقدامات کئے ان کے لئے آپؐ کو کوئی اشتعال نہیں دلایا گیا تھا۔ حالاں کہ یہ خیال غلط ہے کیوں کہ دونوں فریقوں کے مابین حالتِ جنگ قائم تھی اور اہل مکہ برابر اشتعال انگیز کارروائیوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فوجی اقدام کرتے وہ لازماً فریقِ مخالف کی کسی جارحانہ کارروائی کا جواب ہوتا۔ جیسا کہ زمانہ حال کے مسلمان معذرت خواہوں کا خیال ہے۔ جب عام طور پر حالتِ جنگ قائم ہو تو ہر فریق کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ خصوصی فوجی اقدامات عمل میں لائے یا ان کا منصوبہ مرتب کرے۔ لیکن یہ بہر حال تسلیم کرنا ہوگا کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ نہ کی جاتی اور آپؐ اپنا مقصد بغیر

جنگ کے حاصل کر سکتے تو آپؐ کو ہتھیار اُٹھانے کی نہ تو حاجت ہوتی اور نہ آپ خواہ مخواہ کی لڑائی کے خواہشمند تھے۔ ایسی صورت میں بھی جب کہ ان پر کوئی دوسرا فریق حملہ آور ہو مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف جوابی کارروائی کریں بلکہ انھیں صبر کرنے کی بھی تلقین کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ یہ بہتر صورت ہو گی۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ وان صبرتم لہو خیرٌ للصابرین۔ (بنی اسرائیل آیت ۱۲۶)

(اور اگر بدلا لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کر لو تو صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے)

لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کبھی آپؐ کو لڑنے پر مجبور کیا گیا اور آپؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ جنگ کرنے کے قابل ہیں تو آپؐ نے لڑائی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اسلامی مقصد کا حصول اللہ تعالےٰ کا ایک اطلاقی اور غیر مشروط حکم تھا اور اس کام کے لئے نہ صرف وعظ و تبلیغ کی ضرورت تھی بلکہ سماجی اور سیاسی قوت سے کام لینا بھی ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ کی مدنی زندگی آپؐ کی نبوّت کی تکمیل کا ایک ناگزیر مرحلہ تھا اور کسی حیثیت سے اسلام اور سیاست کے مابین مصالحت کی کوشش نہ تھی۔ ہم نے قرآن کی مکّی سورتوں سے اس امر کی شہادت فراہم کی ہے کہ رسول اللہؐ کے یہ تمام اقدامات جو مدنی زندگی میں عمل میں آئے بالکل ناگزیر تھے۔

کشیدہ تعلقات اور ابتدائی جھڑپوں کے نتیجہ میں بالآخر مسلمانوں اور اہلِ مکّہ کے مابین پہلی باقاعدہ جنگ وقوع پذیر ہوئی۔ اہل مکّہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ شام سے ان کا جو تجارتی قافلہ واپس ہو رہا ہے اس پر مسلمان حملہ کرنے والے ہیں تو انھوں نے باقاعدہ فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ رمضان ۲ ہجری / مارچ ۶۲۴ء تقریباً ایک ہزار اہلِ مکّہ کا تقریباً تین سو مسلمانوں سے بدر کے مقام پر مقابلہ ہوا مگر اہلِ مکّہ کو اس مقابلہ میں شکست ہوئی اور ان کے کئی ایک قائدین جنگ میں مقتول ہوئے۔ اسی واقعہ کے کچھ عرصہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بااثر اور طاقتور بدوی قبائل سے معاہدہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر آپؐ کے ساتھ تحالف کرنا چاہتے تھے لیکن یہ قبائل کسی نظریاتی اساس پر آپؐ کے ساتھ اتحاد نہیں چاہتے تھے کیوں کہ درحقیقت یہ لوگ طاقت کے پجاری تھے جیسا کہ بعد کے واقعات اور ان قرآنی ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے جن میں اعراب کی اخلاقی زندگی پر تنقید کی گئی ہے۔ بدر کی لڑائی کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قینقاع پر فوج کشی کر کے اسے شام میں ہجرت

کرنے پر مجبور کیا کیونکہ بنو قینقاع کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو معاہدہ تھا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے اہلِ مکّہ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازش کی تھی۔

لیکن اہلِ مکّہ نے بدر کی ذلّت آمیز شکست سے چراغ پا ہو کر ۳ھ / ۶۲۵ء میں تین ہزار آدمیوں کی ایک فوج تیار کی اور مدینہ سے باہر اُحد کی پہاڑی کے قریب مسلمانوں سے ان کا مقابلہ ہوا۔ پہلے پہل اہلِ مکہ کو اپنی کثرت تعداد اور کثرتِ اسلحہ کے باوجود شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ایک دستہ کو پہاڑی پر متعین کر دیا تھا تاکہ کفار اس طرف سے حملہ آور نہ ہونے پائیں۔ تیراندازوں کا یہ دستہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ کر معرکہ کارزار میں اس اندیشہ کی بنا پر شریک ہو گیا کہ مبادا وہ غنیمت کے مال سے محروم ہو جائے۔ اہلِ مکّہ نے پہاڑی کا درّہ خالی دیکھ کر اس طرف سے حملہ کر دیا۔ اس سے اسلامی لشکر میں سخت انتشار پھیل گیا اور مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو زخم خوردہ ہو چکے تھے خدا ناخواستہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ اپنی قوت کو مجتمع کر لیا لیکن اہلِ مکّہ میدانِ جنگ چھوڑ کر مکّہ کی طرف واپس جا چکے تھے۔ قرآن نے کچھ تو مسلمانوں کی روش پر تنقید کی۔ کچھ انہیں تسکین دی اور پھر یہ کہہ کر ان کی ہمت بندھائی کہ ان کے سو آدمی ایک ہزار کافروں کو شکست دے سکتے تھے لیکن اب خدا کی نظروں میں ان کی کمزوری عیاں ہو چکی ہے پھر بھی وہ اپنے سے دوگنے کافروں کو شکست دے سکتے ہیں۔ یہودیوں پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر حملہ کیا کیوں کہ انہوں نے مسلمانوں کی شکست پر کھلے بندوں اظہار مسرّت کیا تھا اور قبیلہ بنو نظیر کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو ایک سال بیشتر بنو قینقاع کے ساتھ کیا جا چکا تھا۔ بدوی قبائل نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو رہی ہے تو انہوں نے اپنا دوستانہ رویّہ تبدیل کر دیا۔ دو سال بعد ۵ھ / ۶۲۷ء میں مدینہ کے مسلمانوں کو ایک اور بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ مکّہ کو خیبر کے یہودیوں نے پھر لڑائی پر اکسایا۔ چناں چہ انہوں نے دوسرے بدوی قبائل کی مدد سے دس ہزار فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دی تاکہ اس شہر پر قبضہ جما ئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے غیر محفوظ حصوں کے اردگرد خندقیں کھودنے کا حکم دیا۔ ادھر اہلِ مکّہ اور بدوی قبائل نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ جیسا جیسا یہ محاصرہ طول پکڑتا گیا محاصرہ کرنے والی افواج کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور وہ ہمت ہار کر کے واپس چلی

گئیں۔ جنگِ خندق نے اہلِ مکہ کی ان تمام کوششوں پر آخرکار پانی پھیر دیا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو کچلنے کے لئے کر رہے تھے۔ محاصرہ ختم ہونے کے فوراً بعد مسلمانوں نے بنو قریظہ کے یہودی قبیلہ پر حملہ کیا کیوں کہ اب یہ بات بالکل ظاہر ہو چکی تھی کہ یہود اپنے معاہدوں کے بالکل پابند نہ تھے اور اس لئے ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے مابین اس مسئلہ پر سخت اختلاف تھا کہ یہودیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ ایک گروہ جس کے سربراہ سعد بن معاذ تھے اس امر پر مُصر تھے کہ یہودیوں کی مسلسل بے وفائی کے باعث ان کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔ بالآخر یہ گروہ اپنی رائے منوانے میں کامیاب رہا۔ جس کے نتیجہ میں بنو قریظہ کے مردوں کی بہت بڑی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ مگر اس ڈرامہ میں سب سے زیادہ خطرناک کردار منافقین کا تھا جو ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے رہتے لیکن جب یہودیوں پر کوئی آفت آتی تو ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تھے۔

بالآخر رسول اللہؐ کی حکمتِ عملی اپنے مقصد و منتہا کو پہنچنے کے قریب تھی۔ اور وہ یہ تھا کہ بغیر کسی خون ریزی کے مکّہ آپؐ کے قبضہ میں آجائے اور اسے اشاعتِ اسلام کا مرکز بنا دیا جائے۔ سنہ ۶ھ کے آخر (ابتدائے ۶۲۸ء) میں آپؐ نے اپنے حریفوں یعنی اہلِ مکّہ پر سیاست کی ایک کاری ضرب لگائی جس کے خطرناک نتائج کا اندازہ پہلے ہی سے لگا لیا گیا تھا، یعنی آپؐ نے مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے کے لئے مکّہ میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس وقت تک اہلِ مکّہ کی رائے عامہ کا ایک بڑا حصہ آپؐ کے موافق ہو چکا تھا لیکن آپؐ کے کٹر مخالفین کا ایک گروہ اب بھی موجود تھا جو طاقت کے ذریعہ آپؐ کے داخلہ کی مزاحمت کرنے پر آمادہ تھا۔ بالآخر اہلِ مکّہ نے آپؐ سے ایک معاہدہ کی گفت و شنید کرنے کی غرض سے ایک وفد روانہ کیا۔ یہ معاہدہ تاریخ اسلام میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے رسول اللہؐ کو عمرہ کی ادائیگی ایک سال کے لئے ملتوی کرنی پڑی جس سے مسلمانوں میں فوری طور پر غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن اہلِ مکّہ کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کی گفت و شنید پر آمادہ ہو جانا بجائے خود مسلمانوں کی ایک بڑی سیاسی فتح تھی۔ آئندہ سال یعنی سنہ ۷ھ/ ۶۲۸ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیروانِ اسلام نے باقاعدہ طور پر عمرہ ادا کیا۔ سنہ ۸ھ/ ۶۲۹ء میں اہلِ مکّہ کو ایک جنگ میں شریک ہونا پڑا جس میں فریقِ ثانی مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو اہلِ مکّہ کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکّہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اب اہلِ مکّہ پُرامن طور پر اطاعت قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ

صلح کی گفت وشنید شروع ہوگئی ۔ رسول اللہؐ نے تمام اہلِ مکہ کو عام معافی عطا کردی لیکن یہ اعلان کیا کہ خانۂ خدا کو بتوں سے پاک کر دیا جائے گا ۔ تقریباً سارے اہلِ مکہ اسلام لے آئے ۔ فتح مندی اور کامیابی کی اس ساعت میں جب کہ سارا عرب آپؐ کے قدموں کے نیچے تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک عجز و نیاز اور عبودیتِ الٰہی سے جھکا ہوا تھا اور لبوں پر یہ دعا سنی جاسکتی تھی :

" اذا جاء نصر اللہ والفتح و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً ۔ فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا " (سورہ النصر)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب خدا کی مدد اور مکہ کی فتح اپنے آثار کے ساتھ آپہنچے اور آپؐ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی دعا کیجئے وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ۔)

آئندہ دو سال کے اندر عرب کی باقی آبادی بھی برضا و رغبت اسلام کی حلقہ بگوش ہوگئی ، البتہ طائف کے شہر اور ہوازن کے قبائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت مقابلہ کرنے کے بعد اسلام قبول کیا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو اپنا مستقل مسکن قرار دیا اور یہاں سے آپؐ نے ۹ھ / ۶۳۰ء میں شرقِ اردن کے شمالی عرب عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مہم روانہ کی ، لیکن ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ یعنی ۸ جون ۶۳۲ء کو آپؐ نے ایک مختصر علالت کے بعد جس میں صرف آپؐ کو معمولی بخار کی تکلیف تھی آپؐ نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی لیکن اس سے قبل آپؐ شمال کی جانب ایک مہم روانہ کرنے کا حکم جاری فرما چکے تھے ۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسلام کو صرف جزیرہ نمائے عرب میں محصور کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ لیکن مغرب کے اہلِ فکر کا ایک معتدبہ گروہ یہ پُر زور دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف یہ چاہتے تھے کہ جو اہلِ عرب ایرانی اور بازنطینی حکومتوں کے تحت رہ گئے تھے انھیں دائرۂ اسلام میں لایا جائے ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف عربوں کے قومی مذہب کی حیثیت دینا چاہتے تھے ، ہم نے گزشتہ صفحات میں قوی دلائل کی بنا پر اس نظریہ کی تردید کی ہے ۔ رسول اللہؐ کی زندگی کے مطالعہ نیز آپؐ کی سربراہی میں اسلامی تحریک کا جو داخلی رجحان تھا اس پر نظر غائر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کی تکمیل کے لئے بیرونِ عرب اس کی توسیع ضروری تھی ۔

اسی دلیل کی بنا پر ہم ان مبینہ خطوط کو مستند ماننے پر آمادہ ہیں جو آپؐ نے شہنشاہ حبش، حاکم مصر مقوقس، شہنشاہِ ایران اور بازنطینی حکمران کو اسلام کی دعوت دینے کی غرض سے لکھے تھے، اگرچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان خطوط کا مضمون اس مضمون سے مختلف ہو سکتا ہے جو رسول اللہؐ نے واقعتاً تحریر کروایا تھا۔ چنانچہ ان خطوط کے متن پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے مغربی فضلاء نے اس واقعہ کی نسبت شبہات ظاہر کئے ہیں یا سرے سے اس کی تردید کر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حکمرانوں کو کوئی خط لکھا تھا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عرب تھے اور یہ بالکل ناقابلِ یقین ہے کہ آپؐ نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کی جرأت کی ہو گی بالخصوص جب کہ آپؐ کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس کو استعمال کر کے آپؐ ان حکمرانوں کو اسلام لانے پر مجبور کر سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت محتاط سیاست دان تھے۔ اس لئے آپؐ سے اس بے باکی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا کم بے باکی تھی کہ ایک بچے نے جس کے والد اس کی پیدائش سے قبل وفات پا چکے تھے جس کی ماں نے اس کی صغر سنی میں اسے داغِ مفارقت دے دیا تھا، اور جو دنیوی حیثیت سے بالکل بے مایہ تھا، بالخصوص ایک ایسے معاشرہ میں جہاں دنیوی وسائل کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ دعویٔ نبوت کے چند سال بعد سارے عرب کو اسلام کا مطیع اور باجگزار بنا دیا۔ پھر کیا عربوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دس سال بعد دنیا پر یہ ثابت نہیں کر دیا کہ ان از کار رفتہ اور قریب المرگ حکومتوں کی شکست و ریخت ایک بالکل قدرتی امر تھا نہ کہ تاریخ کا کوئی نادر اور عجوبہ روزگار واقعہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں متخاصم سلطنتوں کی باہمی جنگوں کے نشیب و فراز سے ناواقف نہ تھے۔ جب ان حقائق میں اس واقعہ کا اضافہ کر دیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک سخت ابتلاً و آزمائش کے دور میں ہجرت حبشہ کے بعد شہنشاہ حبش کی ہمدردیاں حاصل تھیں، نیز یہ کہ مقوقس حاکم اسکندریہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوستانہ رویہ کا اظہار کیا تھا اور آپؐ کو ایک باندی ماریہ قبطیہ تحفہ میں پیش کی تھی، جس کے بطن سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے جن کا انتقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل ہو گیا اور یہ کہ مسلمانوں کو خود ان ممالک کی عیسائی آبادی سے ہمدردی اور تعاون کی توقعات پیدا ہو گئی تھیں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان حکمرانوں کو کیوں خطوط لکھے اور یہ کہ یہ خطوط اسلامی تحریک کے داخلی رجحان اور عرب کے گرد و پیش کی حکومتوں کے اندرونی حالات کے قدرتی اور منطقی نتیجہ کے طور پر لکھے گئے۔ پھر اگر آپؐ عیسائی حکمرانوں کو دعوتِ اسلام کی غرض سے خطوط لکھ سکتے تھے تو ایرانی شہنشاہ کو خط لکھنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ عرب سے باہر بھی اسلام کو قسمت آزمائی کرنی چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر اقدام یہی تھا کہ بیرونِ عرب کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔

اپنی وفات سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ اور ایمان کی بنا پر ایک عالم گیر انسانی اخوت کے قیام کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیئے تھے اور آپؐ نے اس اصول کو عربوں کے خونی رشتوں اور قبیلوی وفاداری کا قائم مقام بنانے کی بڑی زبردست جدوجہد کی۔ اس طرح امتِ مسلمہ جو مسلم معاشرہ کی ہیئت متعین کرنے میں فیصلہ کن آواز رکھتی ہے اور جو اپنے داخلی استحکام کے کچھ اصول بھی رکھتی ہے آپؐ ہی کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی اگرچہ آپؐ کی وفات کے بعد اس امت میں بعض اہم تغیرات ہوئے مثلاً اسلامی معاشرہ میں غیر عرب اقوام کا شمول جن کی تعداد مرورِ زمانہ کے ساتھ عربوں کی تعداد سے بڑھ گئی۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپؐ نے جو پُر تاثیر خطبہ دیا اس میں آپؐ نے رسمی طور پر ان اصولوں کی توضیح کی جن پر مختصراً وہ تمام تغیرات مبنی تھے جو اسلامی تحریک کی واقعی رفتار میں وقوع پذیر ہوئے اور جن کی طرف اس تحریک کا میلان اب بھی قائم ہے کیونکہ یہ اصول ایک مقصد و منتہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصولوں میں انسانیت پروری، مساوات، معاشرتی اور معاشی عدل، خیر و تقویٰ اور باہمی ارتباط بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس خطبہ کے متن کی صحت پر بھی عصرِ حاضر کے فضلاء نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے لیکن اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ خطبہ اپنے صحیح الفاظ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ داخلی شواہد مثلاً سودی استحصال کی پُر زور مذمت جس کی قرآن نے بھی اتنی ہی مذمت کی ہے نیز یہ حقیقت کہ یہ خطبہ ایک طول طویل عرصہ کی تیاری کے بعد دیا گیا (اس سے ایک سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج میں شریک نہیں ہوئے بلکہ آپؐ نے قبائل کے وفود سے ملاقات کے لیے مدینہ میں قیام فرمانا مناسب خیال کیا) ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خطبہ کا متن فی الجملہ صحیح اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن بعد کی روایات میں جو اس خطبہ سے متعلق پائی جاتی ہیں بعض ایسے جملے بھی موجود ہیں جو غالباً اصل متن میں نہیں

ہے۔ مثلاً یہ جملہ کہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر اور کسی غیر عرب کو کسی عرب پر کوئی تفوق حاصل نہیں بجز اس بنا پر کہ اس میں تقویٰ کی صفت زیادہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس جملہ کا بنیادی تخیل قرآن اور رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا منطقی اور قدرتی نتیجہ ہے لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ آپؐ نے ایک ایسے زمانہ میں عرب اور غیر عرب کا ذکر چھیڑا ہوگا جب کہ یہ مسئلہ معاشرہ میں پیدا ہی نہ ہوا تھا اس لئے یہ جملہ ان تغیرات کی نشان دہی کرتا ہے جو زمانہ مابعد کے اسلامی معاشرہ میں رونما ہوئے۔

یہود اور عیسائی

جس وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دعوت کا حکم دیا گیا اسی لمحہ سے آپؐ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ آپؐ کی دعوت انبیائے سابقہ کی دعوت کا ایک تسلسل ہے یا کم از کم ان کی دعوت کا احیاء ہے۔ چناں چہ ایک ابتدائی مکّی سورت میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:۔

ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ (سورۃ الاعلیٰ۔ آیت ۱۹)

(اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی)

لیکن یہ طرزِ فکر صرف نظری سطح یا نصب العینی مذہبی سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ کتاب کے واقعی عقائد یا ان کی عملی زندگی اور اس کی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق و امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے۔ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے مذہبی رہنماؤں مثلاً حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں ایک خاص روش اختیار کی ہے لیکن اس نے اپنے زمانہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عملی زندگی اور اخلاق پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ نیز ان کی بعض باتوں کو بہ نظرِ استحسان بھی دیکھا ہے۔ ان دونوں مختلف پہلوؤں کو ایک کر دینے اور ان کے فرق کو نظر انداز کر دینے سے بے حد الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، علمی سطح پر بالخصوص جہاں قرآن یہودیوں سے بحث کرتا ہے ان کے ساتھ مسلمانوں نے جو سیاسی معاھدے کئے تھے اور پھر یہود نے ان معاھدوں کی جو خلاف ورزیاں کی تھیں ان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ البتہ عیسائیوں کی حد تک قرآن صرف کلامی اور مذہبی سطح تک اپنی بحث کو محدود رکھتا ہے۔ لیکن خالص کلامی سطح پر یہ مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے کہ یہودی اور عیسائی مذاہب کے بارے میں رسول اللہؐ کو جو معلومات حاصل تھیں ان کے مآخذ کیا تھے۔ ذیل کے

معروضات سے اس مسئلہ کی نوعیت واضح ہو جائے گی۔ اگرچہ قرآن نے ابتدا ہی سے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا رسول تسلیم کر لیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں ہی قرآن نے عیسائیوں کے اس دعویٰ کو رد کر دیا تھا کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ (مثلاً سورہ مریم)۔ اس حقیقت کا انکار کرنا اور اس کے مقابلہ میں یہ کہنا جیسا کہ عیسائی علماء ہمیشہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے سامنے عیسائیوں نے تثلیث کا جو تصور پیش کیا تھا وہ بہت بھونڈا تھا یعنی اس کی رو سے حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی مادی یا نیم مادی اولاد قرار دیا گیا تھا، اور یہ کہ اگر تثلیث کا کوئی لطیف تر عقیدہ رسول اللہؐ کے سامنے پیش کیا جاتا جس میں مادیت کی آمیزش نہ ہوتی تو آپؐ ایسے عقیدہ کو رد نہ فرماتے۔ لیکن یہ دلیل معقولیت سے بالکل عاری ہے، خود اہلِ مکہ کا اپنے معبودوں کے بارے میں جو عقیدہ تھا وہ بھی جیسا کہ قرآن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے بالکل بھونڈا اور یکسر مادی نہ تھا۔ اگرچہ قرآن مشرکین عرب پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے ہیں لیکن یہ اصطلاح یہاں اپنے معروف معنوں میں استعمال نہیں کی گئی ہے کیوں کہ ان معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے اجزاء کی حیثیت دی جاتی تھی۔ (سورہ الزخرف۔ آیت ۱۶)

اس معمہ کو حل کرنے کے لئے یہ مفروضہ قائم کرنا نہایت ضروری ہے کہ عرب میں عیسائیوں یا عیسائیت زدہ اشخاص (عرب حنفاء) کا ایک گروہ بہت زمانہ سے موجود تھا جو تثلیث کے عقیدہ کا قائل نہیں تھا اور جس کا تعلق عیسائی کلیسا کے ساتھ غالباً نا استوار تھا۔ ایسے مفروضہ کے بغیر جیسا جیسا ہم آگے بڑھیں گے مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوتا جائے گا۔ کیوں کہ اگر قرآن نے مکہ میں ہی تثلیث اور الوہیت مسیح کے عقیدہ کو رد کر دیا تھا اور مدینہ میں بھی اسی طرح ان عقائد کو رد کرتا رہا تو پھر وہ یہ کیوں کہتا رہا کہ:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر، وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔ (سورہ بقرہ۔ آیت ۶۲، سورہ المائدہ آیت ۶۹)

(اور یہ یقینی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات صفات پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسے لوگوں کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور وہاں جا کر کسی قسم کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے)

لیکن شاید اس سلسلہ میں سب سے زیادہ واضح بات سورہ المائدہ کی آیات ۸۲ تا ۸۳ میں کہی گئی ہے :۔

لتجدن اشدّ الناس عداوۃً للذین آمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃً للذین آمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ۔ ذالک بان منھم قسیسین ورھباناً وانھم لا یستکبرون، واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تریٰ اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق ۔

(تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیے گا جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ اس سبب سے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں اور اس سبب سے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔ اور جب وہ اس کو سنتے ہیں جو کہ رسول کی طرف بھیجا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔)

یہودیت اور یہودیوں پر بھی اسی دلیل کا اطلاق ہوتا ہے۔ کلامی سطح پر قرآن میں یہودیت کا ایک عنصر موجود ہے۔ یہ امر نہ صرف باعثِ حیرت نہیں بلکہ قرآن از ابتدا تا انتہا اس حقیقت پر بار بار اصرار کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں کئی بار بیت المقدس کو ارضِ مبارکہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ اگر رسول اللہؐ کو یہود مدینہ کی بدعہدی اور فتنہ انگیزی کا تلخ تجربہ نہ ہوتا تو آپ مکہ کو اسلام کا دینی مرکز قرار دینے کے بجائے بیت المقدس کو مرکزِ اسلام قرار دیتے اور مکہ کی دینی حیثیت بیت المقدس کے مقابلہ میں ثانوی رہ جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں مکہ کا حصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی تحریک کا عظیم ترین منصوبہ تھا تو پھر یہ فرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اسلام میں کعبہ کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اگر بیت المقدس کو شروع ہی سے یہ مستقل حیثیت حاصل ہوتی تو مدینہ کے یہودی اسلام کی کتنی ہی مخالفت کرتے اس سے بیت المقدس کی حیثیت پر کوئی اثر نہ پڑتا جس طرح یہودیوں کی مخالفت کا حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ وغیرہ کے مقام پر جو انہیں اسلام میں حاصل تھا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان یہودیوں کو مٹا دیا جاتا یا انھیں جلاوطن کر دیا جاتا جیسا کہ واقعتاً کیا گیا اور پھر بھی بیت المقدس کی حیثیت اسی طرح قائم رہتی البتہ اس بات پر ضرور زور دیا جاتا کہ دینی اعتبار سے بیت المقدس کو یہود کے ساتھ کوئی خصوصیت

نہیں ہے جس طرح حضرت ابراہیم وغیرہ کے بارے میں کہا گیا کہ انہیں یہود کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کے اندر دو رجحانات ایسے پائے جاتے تھے جن کی وجہ سے حضرت ابراہیم اور دیگر مذہبی شخصیتوں کو ان کے سواد اعظم سے دینی سطح پر الگ کر دینا ضروری ہو گیا۔ قرآن پہلے رجحان کی بار بار تعریف کرتا ہے اور دوسرے کی مذمت کرتا ہے۔ مثالاً:۔

منہم امۃ مقتصدۃ وکثیر منہم ساء ما یعملون۔ (سورہ المائدہ۔ آیت ۶۶)

(ان میں ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی ہے اور زیادہ ان میں ایسے ہیں کہ ان کے کردار بہت بُرے ہیں)

ان سے کہا گیا کہ وہ تورات اور انجیل پر عمل کریں لیکن تمام منظم مذہبی روایات کے اجارہ داروں کی طرح یہودی اور عیسائی آپس میں دست و گریبان تھے اور ہر فریق اس امر کا دعویدار تھا کہ نجات و فلاح کا دروازہ صرف اسی کے لئے کھلا ہے۔

وقالت الیھود لیست النصاریٰ علی شیٔ وقالت النصاریٰ لیست الیھود علی شیٔ وھم یتلون الکتاب۔ (سورہ البقرہ، آیت ۱۱۳)

(اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں حالاں کہ یہ سب لوگ (آسمانی) کتابیں پڑھتے ہیں)

ولن ترضیٰ عنک الیھود والنصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم۔ قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ۔

(سورہ البقرہ۔ آیت ۱۲۰)

(یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ جب تک آپ ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جائیں آپ سے کبھی خوش نہ ہوں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت کا راستہ تو درحقیقت وہی ہے جس کو خدا نے بتلایا ہے)

اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ حضرت ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی اور حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی پیرو وہی لوگ ہیں جو ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ (سورہ آل عمران۔ آیت ۶۷، ۶۸)۔ یہ اعلان صرف حضرت ابراہیم ہی کے سلسلہ میں نہیں کیا گیا بلکہ تمام دوسرے مذہبی رہنماؤں اور پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کے بارے میں بھی یہی کہا گیا (سورہ البقرہ آیات ۱۳۵، ۱۳۶ اور ۱۴۰)

اس طرح قرآن نے ان تمام لوگوں کے دعاوی کو رد کر دیا جو هدایت الٰہی اور صداقت ربانی کے اجارہ دار بننا چاہتے تھے اور ساتھ ہی مسلمانوں سے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا :۔

وان تتولوا قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (سورہ محمد آیت ۳۸، سورہ المائدہ آیت ۵)

(اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے)

سیاسی سطح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کی بدعہدی کا بہت تلخ تجربہ ہوا تھا، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم مختصراً بیان کر چکے ہیں۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے ان کے ساتھ ایک معاهدہ پر دستخط فرمائے یہ معاهدہ مدینہ کے منشور کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس منشور کی رُو سے انہیں کامل مذہبی خود مختاری دی گئی تھی بشرطیکہ مدینہ پر حملہ کی صورت میں وہ اس کے دفاع میں شرکت کریں۔ لیکن اس تحالف کے ایک فریق کی حیثیت سے یہودیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی دوستی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نئے دین کا استہزا کیا بلکہ جب کبھی اہل مکہ کے ساتھ مسلمانوں کا تصادم ہوا تو انہوں نے اہلِ مکہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں ہر طرح سے امداد بہم پہنچائی نیز خود مدینہ کے اندر منافقوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ مکہ کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جتنی بڑی لڑائیاں پیش آئیں ان میں سے ہر لڑائی کے بعد آپ نے یہود مدینہ کے خلاف جنگی کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مدینہ کے یہودی یا تو بالکل نیست و نابود ہو گئے یا جلاوطن کر دیئے گئے۔ صرف مدینہ کے یہودیوں ہی نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ بدعہدی نہیں کی بلکہ خیبر کے یہودیوں نے بھی جو حجاز کا ایک سرسبز و شاداب نخلستان تھا اہلِ مکہ کی اس مہم میں کافی اہم حصہ لیا جو انھوں نے مدینہ پر چڑھائی کے سلسلہ میں دس ہزار فوج تیار کرنے کے لئے شروع کی تھی۔ چنانچہ سنہ ۹ھ/سنہ ۶۳۰ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو فتح کر کے اس کے باشندوں پر جزیہ عائد کیا۔ بعد میں مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی عیسائیوں یا یہودیوں کو مطیع و باجگزار بنانے کا موقعہ ملا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مثال پر عمل کرتے ہوئے یہود و نصاریٰ پر جزیہ لگایا۔ پھر دوسرے مذاہب کے پیرووں کے ساتھ بھی یہی معیاری سلوک کیا گیا۔

تتمہ

جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرے گا وہ یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا

ہے کہ آپؐ کی ذات میں اعلیٰ درجہ کی روحانیت کے ساتھ ایک ایسی سیاسی اور انتظامی فراست جمع تھی جو انسان کی دینی قیادت کی تاریخ میں بہت کم یاب ہے۔ نیز وہ اس تاثر سے بھی خالی نہیں رہ سکتا کہ جہاں تک رسول اللہؐ کی ذات کا تعلق ہے یہ سیاسی اور انتظامی فراست بالکلیہ اس روحانی نصب العین کے تابع تھی جس کو آپؐ بالآخر اپنی زندگی میں حاصل کر کے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنہوں نے اپنی ذات کے متعلق اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ آپؐ وحیِ الٰہی کے مہبط ہیں تاریخ نبوّت میں ایک منفرد ہستی کے مالک تھے اور اس کے ساتھ ہمیں ایک اہم حیثیت سے اسلام کے جوہری تخیل کو بھی ماننا پڑے گا۔ عیسائی مبلغین اور مغربی فضلا رنے (جنہوں نے حالیہ دور میں اپنے سابقہ طرزِ فکر میں بعض خوشگوار تبدیلیوں کا ثبوت دیا ہے) رسول اللہؐ کی شخصی سیرت پر اس وجہ سے اعتراضات کئے ہیں کہ آپؐ ایک سے زیادہ عورتوں کو قیدِ نکاح میں لائے۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے ان اعتراضات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپؐ نے یہ شادیاں لذّت کی خاطر نہیں کی تھیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے جو آپؐ سے عمر میں کئی سال بڑی تھیں ان کی اپنی درخواست پر نکاح کیا تھا اور حضرت خدیجہ کی وفات تک جب کہ آپؐ کی عمر پچاس سال کی تھی آپؐ نے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ پھر ایک ایسے شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ دین کا حکم ملنے سے پہلے پچیس سال کی عمر میں لذّت کی خاطر نکاح نہیں کیا یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ پچاس سال کی عمر میں لذت پرست بن جائے گا بالخصوص جبکہ وہ ایک مہتم بالشان اور مہیب جدوجہد میں مصروف ہو جس میں اس کی حیثیت صرف ایک مبلّغ کی نہ ہو جو قیصر کو قیصر کا حق اور خدا کو خدا کا حق دینا چاہتا ہو بلکہ تاریخ کے گوشت پوست میں ایک عظیم الشان روحانی نظام کی تخلیق کا کام انجام دے رہا ہو۔

لیکن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی ایک عورتوں سے نکاح بھی کر لیتے جیسے کہ اس زمانہ کے عرب عام طور پر کیا کرتے تھے تب بھی اس میں کوئی اخلاقی قباحت نہ ہوتی بشرطیکہ مناسب حدود کا لحاظ رکھا جاتا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ نہ تو یک زوجی اور نہ تعدد ازدواج ہر زمانہ کے مسلّم رسم یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مقرر کردہ طریقہ ہے بلکہ معاشرتی حالات کی مناسبت سے ان میں سے کسی طریقہ کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اگرچہ مناسب حالات کی موجودگی میں یک زوجی ایک مثالی طریقہ ہے۔ ہم اس عمومی مسئلہ پر

آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے کہ زمانہ اسلام کے عرب میں (جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب کے بعض ملکوں میں ہوا) اس قسم کے حالات موجود تھے جن میں یک زوجی کے طریقہ پر فوری طور پر عمل کرانا ناممکن تھا۔ اس لئے قرآن نے یک زوجی کو ایک اخلاقی ضابطہ کے طور پر تسلیم کرلیا جس پر مناسب حالات پیدا ہوتے ہی لوگوں کو آمادہ عمل کرنا ضروری تھا لیکن اس وقت کی صورتِ حال میں اس مسئلہ کے قانونی حل کے طور پر تعدّد ازدواج کی اجازت دے دی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عرب کے حالات ان حالات سے کہیں زیادہ بدتر تھے جو جنگِ عظیم کے بعد مغرب کے بعض ممالک میں رونما ہوئے۔ دونوں صورتوں میں مشترکہ عنصر یہ تھا کہ مسلسل جنگوں کے باعث عورتوں کی تعداد مردوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوگئی تھی لیکن مغرب میں حالات کی ابتری اس وجہ سے نہیں بڑھی کہ وہاں عورتیں معاشی حیثیت سے زیادہ خودمختار تھیں۔ علاوہ ازیں وہاں مردوں اور عورتوں دونوں کو سماجی تحفظ حاصل تھا۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کی عظمت کا فیصلہ کرنے میں نہ تو اس امر کو کوئی دخل ہے کہ آپؐ نے کتنی شادیاں کیں اور نہ اس کا فیصلہ آپؐ کے ذاتی کارناموں کی بنا پر کیا جائے گا (خود آپؐ کی فروتنی کی یہ حالت تھی کہ آپؐ نے اپنی تمام کامیابیوں کو اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت پر محمول کیا) بلکہ اس کا فیصلہ اس بنا پر کیا جائے گا کہ آپؐ اپنے بعد انسانیت کے لئے ایک عظیم الشان روحانی ورثہ چھوڑ گئے یعنی ایک طرف تو آپؐ نے کچھ نصب العین پیش کئے اور دوسری طرف ان کے حصول و تکمیل کا ایک ٹھوس اور محسوس طریقہ بھی آپؐ نے متعین فرما دیا، اور یہی دو چیزیں ہیں جن کے ذریعہ اس زمانہ میں بھی انسانی مسائل کو بہترین طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔